مظفر علی سید کی تنقید

ثاقب فریدی
ریسرچ اسکالر (اردو)
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، انڈیا

MUZAFFIR ALI SYED AS A CRITIC

Saqib Faridi
Research Scholar (Urdu)
Jamia Millia Islamia, New Dehli, India

Abstract

Muzaffir Ali Syed is big name as regard to criticism of modern Urdu literature. He penned on various topics but his original work remained to be criticism throughout his life. Among his valuable books is Sukhan aur Ahle Shukhan. This book was published posthumously and carries important discussions on different aspects of Urdu literature. Distinctive marks of Syed's criticism may rightly be perceived through the contents of this book. This article presents a reviewal study of the said book.

Keywords:

لارنس، مظفر علی سید، انتظار حسین، غالب، اقبال، اردو، فکشن، گیت، نغمگی، خامہ بگوش، فلسفہ، غزل، لاہور

''سخن اور اہل سخن'' مظفر علی سید کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں مظفر علی سید کے وہ مضامین شامل ہیں جو ان کی حیات میں بصورتِ کتاب نہ آ سکے۔ادب میں مظفر علی سید نے بطور نقاد، محقق اور مترجم اپنی شناخت قائم کی۔''سخن اور اہل سخن'' کے تنقیدی مضامین کے علاوہ انھوں نے مشفق خواجہ کے ادبی کالموں کے تین مجموعے ''خامہ بگوش کے قلم سے، سخن در سخن اور سخن ہائے گفتنی'' مرتب کیے۔''احمد ندیم قاسمی کے بہترین افسانے'' مرتب کیے۔ایچ۔ڈی۔لارنس کی کتاب '' فکشن، فن اور فلسفہ'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔اس کے علاوہ ''تنقید کی آزادی''، ''پاک فضائیہ کی تاریخ'' اور ''یادوں کی سرگرم'' بھی ان کی اہم تصانیف ہیں۔انتظار حسین ''سخن اور اہل سخن'' کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

> ''ابھی مظفر نے بی اے کا امتحان نہیں دیا تھا۔اس سے پہلے ہی وہ ٹی ہاؤس میں آن بیٹھا اور ہمارے بیچ بیٹھ کر اپنے عہد کے نقادوں پر تبصرہ آرائی شروع کر دی۔بس ایک عسکری صاحب سے اس نے تھوڑا خم کھایا۔باقی سب اس کے نشانے کی زد میں تھے۔۔۔ اصل میں مظفر نے بالغ ہونے سے پہلے بہت سی کتابیں پڑھ لی تھیں یا کہہ لیجیے کہ زمانہ نابالغی کے بیچ ہی وہ بالغ ہو گیا تھا۔'' (۱)

انتظار حسین کا یہ اقتباس اس بات کی وضاحت ہے کہ مظفر علی سید نے اپنے ابتدائی ایام ہی سے تنقیدی مضامین لکھنے شروع کر دیے تھے۔خصوصاً انھوں نے اپنے معاصر شعرا مجید امجد، اختر الایمان، مختار صدیقی اور ن۔م۔راشد وغیرہ پر بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں مضامین لکھے جو احمد ندیم قاسمی کے رسالہ '' سویرا'' میں شائع ہوئے۔مظفر علی سید کا مطالعہ بہت وسیع اور نظر گہری تھی۔انتظار حسین کا یہ اقتباس اس بات کی توثیق ہے کہ مظفر علی سید کا شمار شروع سے ہی اچھے لکھنے والوں میں تھا۔یہی وجہ تھی کہ جب ۲۰۰۰ء میں مظفر علی سید کی وفات ہوئی تو ''سخن اور اہل سخن'' کے تنقیدی مضامین کے متعلق ان کے دوستوں کو تشویش ہوئی۔انتظار حسین نے ان مضامین کا مسودہ ان کے بیٹے سے حاصل کیا اور اسے ترتیب دیکر سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور سے ۲۰۱۶ء میں شائع کرایا۔

''سخن اور اہل سخن'' میں مختلف موضوعات پر ۲۲ مضامین ہیں جن میں ''اردو ادب کی صورت حال، عصر حاضر میں ادب کا کردار، ترجمے کی جدلیات، حرف و صوت کا رشتہ، ادب اور تاریخی شعور، میرؔ کی فارسی سخن گوئی، نقد نیاز و نگار، حفیظ ہشیارپوری، منٹو، بیدی، غلام عباس، انتظار حسین، میراجی، ن۔م۔راشد، مجید امجد، اختر الایمان، مختار صدیقی، ناصر کاظمی، سلیم احمد وغیرہ پر مضامین ہیں۔اس ایک مضمون میں ''سخن اور اہل سخن'' کے تمام عناوین پر گفتگو ممکن نہیں تھی لہذا میں نے یہاں بعض مضامین پر ہی کچھ بات کی ہے۔گیت کار میراجی میں مظفر علی سید نے یہ بات لکھی ہے کہ اردو شاعری کے تعلق سے عظمت اللہ خاں کے اعتراضات وہی ہیں جو ان کے بعد کلیم الدین احمد نے دہرائے یعنی ریزہ خیالی، پریشاں فکری، غیر واقعاتی اور غیر منظم انداز بیان۔

عظمت اللہ خان اور کلیم الدین احمد دونوں نے اردو غزل کی مخالفت کی تھی ۔غزل کے تعلق سے دونوں کے فقرے بہت مشہور ہیں ۔کلیم الدین احمد نے غزل کے متعلق کہا تھا کہ ''غزل ایک نیم وحشی صنف سخن ہے'' اور عظمت اللہ نے اردو غزل کی گردن بے دریغ مار دینے کی بات کہی ۔کلیم الدین احمد اور عظمت اللہ خاں کے تنقیدی میلانات اپنے ذاتی شعور اور تجربے کی بنیاد پر قائم ہوئے ۔لہٰذا کلیم الدین احمد کے حوالے سے یہ بات کہ (انھوں نے عظمت اللہ خاں کے اعتراضات اپنی کتاب میں دہرائے ہیں) مناسب معلوم نہیں ہوتی ۔عظمت اللہ خاں کے اعتراضات دہرانے کا مطلب تو یہی نکلتا ہے کہ کلیم الدین احمد نے اس ضمن میں کوئی نئی بات نہیں کہی اور یہ کہ ان کے نظریات کا مرجع عظمت اللہ خاں ہیں جبکہ ایسا بالکل نہیں ہے ۔حقیقت یہ ہے کہ کلیم الدین احمد کے تنقیدی رویہ میں ان کا ذاتی مطالعہ شامل ہے ۔

میراجی کے گیتوں کے تعلق سے مظفر علی سید کا خیال ہے کہ ان میں نغمگی اور سریلا پن تو ہے لیکن یہ نغمگی ساحر و ساغر کے گیتوں کی نغمگی کی طرح غور و خوض اور فکر انگیزی سے خالی نہیں ہے ۔ بلکہ میراجی کے گیتوں میں گیان اور دھیان باہم دست و گریباں رہتے ہیں ۔ وقت پڑنے پر ایک دوسرے میں گھل مل جاتے ہیں ۔یعنی میراجی کے گیتوں میں جذبہ و فکر دونوں ہم آہنگ ہیں ۔ دراصل مظفر علی سید نے جذبہ و فکر کو ایک دوسرے سے الگ ذہنی کیفیات فرض کرنے کے رویے کو رد کیا ہے ۔شاعری میں جذبہ یا فکر کوئی ایسی علاحدہ شے نہیں ہے جس پر انگلی رکھ کر یہ اشارہ کیا جاسکے کہ یہاں پر جذبہ ہے اور یہاں فکر ۔شاعری میں جذبہ و فکر دونوں سیال صورت میں کچھ اس طرح مل جاتے ہیں کہ انھیں علاحدہ نہیں کیا جاسکتا ۔ہاں یہ ضرور ہے کہ کہیں جذبے کا عنصر زیادہ ہوتا ہے تو کہیں فکر غالب آتی ہے ۔لریکل شاعری کے تعلق سے مظفر علی سید نے بہت عجیب بات کہی ہے:

> ''بعض لوگوں کی موسیقی کھینچ کھینچا کر گلے کی راہ اختیار کرتی ہے اور بعض کا سریلا پن، ان کے ذہن میں بسی ہوئی تمام موسیقی، تمام سنی ہوئی سروں اور موسیقار عالم کی بنائی ہوئی، مظاہر قدرت کی گائی ہوئی تمام دھنوں کو سارے بدن کے رگ و پے میں تقسیم کر دیتا ہے ۔۔۔ ایسے لوگ جب لریکل شاعری کرتے ہیں تو بڑے بڑے گلے باز اور موسیقی کا عملی تجربہ رکھنے والے بھی لفظوں میں ویسا نغمہ سمونے سے قاصر رہ جاتے ہیں'' ۔(۲)

اردو شاعری میں سب سے زیادہ غنائیت تو امیر خسرو کے یہاں ملتی ہے اور وہ خوش گلو بھی تھے ۔خود میراجی کے عہد میں کئی ترقی پسند شعرا کی شاعری میں غنائیت کا عنصر غالب ہے جن میں مجاز، فیض اور مخدوم وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں ۔ان کے یہاں بھی غنائیت بے معنی نہیں ہے ۔خوش گلو ہونا اور شاعری کے الفاظ میں نغمگی سمونا اگرچہ الگ الگ باتیں ہیں لیکن عین ممکن ہے کہ دونوں صفات ایک جگہ بھی یکجا ہو جائیں اور علاحدہ علاحدہ بھی موجود ہوں ۔میراجی کی شاعری کی غنائیت اگرچہ بہت مختلف تھی اور اس میں بڑی حد تک غور و فکر کا عنصر بھی

شامل تھا لیکن مظفر علی سید نے ساحر لدھیانوی اور حفیظ جالندھری کی شاعری کی غنائیت کو کمتر اور گلے باز کہا ہے۔ اصل میں میراجی کے ساتھ ساحر اور حفیظ جالندھری کا نام لینا بھی مناسب نہیں ہے۔ مظفر علی سید کا خیال ہے کہ میراجی بھگتی عہد کی شاعری، وید، مہابھارت، گیتا اور کالی داس کے ترجموں میں استعمال شدہ مقامی لفظوں اور قدیم ہندی تہذیب اور اس کی روح سے بخوبی آشنا تھے اور ان کی شاعری میں لفظوں کی ثروت مندی بھی نظر آتی ہے۔ قدیم ہندوستانی تہذیب اور ہندو دیومالائی عناصر سے گہرے لگاؤ ہی کا نتیجہ ہے کہ میراجی کی شاعری میں جنگل، مندر اور سادھوؤں کی آوارہ گردی ہے۔ ان کی شاعری میں اساطیر کا عکس ہندو دیومالائی عناصر کی دین ہے۔ وزیر آغا نے تو میراجی کی شاعری میں آزاد پنچھیوں کو آوارہ سادھوؤں کا استعارہ قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ان کی شاعری میں آزاد پنچھی جنگل کی تصویر اور زیادہ خوبصورت بنانے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ مظفر علی سید نے میراجی کے گیتوں کے موضوعات کے متعلق یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ان میں تنوع بھی ہے اور نیا پن بھی۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''عظمت اللہ سے لے کر میراجی تک لریکل شاعری کے جو جو پہلو اور جو جو موضوع تمام لوگوں نے برتے ہیں ان پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے پھر محسوس ہوگا کہ میراجی کے کئی موضوع اور پھر ان کے کئی ایسے تفصیل کے پہلو ہیں جن کو کسی گیت لکھنے والے نے چھوا ہی نہیں ہے''۔(۳)

مظفر علی سید نے نہ صرف میراجی کے گیتوں کا مطالعہ کیا تھا بلکہ ان سے ماقبل لکھے گئے گیتوں کے موضوعات، ان میں برتے گئے الفاظ، ان کی نغمگیت اور ان میں موجود فکر انگیز پہلوؤں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میراجی کی ان تمام خوبیوں کی نشاندہی کر دیتے ہیں اور میراجی کی شاعری میں بعض ایسے فکری پہلو تلاش کر لیتے ہیں جس طرف عموماً ہماری نظر نہیں پڑتی۔

مظفر علی سید نے اپنے مضمون راشد اور ایران کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ راشد کی نظموں کے مطالعے میں جو چیز سب سے زیادہ حائل ہوتی ہے وہ راشد کی زبان ہے۔ راشد کی زبان کے متعلق یہ عمومی رائے ہے کہ انھوں نے فارسی زدہ زبان استعمال کی۔ ان کی نظموں میں فارسی تراکیب دشواری کا باعث بنتی ہیں۔ مظفر علی سید کا خیال ہے کہ راشد کا فارسی آمیز اسلوب ایران جانے سے قبل بھی کم و بیش اسی نوعیت کا تھا اور ان کے اس اسلوب کے متعلق جو شکایت کی گئی وہ خاصی بعد از وقت تھی۔ راشد کے اسلوب میں مشکل پسندی ضرور ہے لیکن دیکھنا یہ چاہیے کہ اس مشکل پسندی کی جہتیں روشن ہوئیں یا نہیں۔ ایران میں اجنبی کی نظمیں ماوراء کی نظموں کے مقابلے میں زیادہ فارسی زدہ ہیں۔ بلکہ ماوراء کی نظموں میں بھی فارسی کا اثر خوب ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ سمجھ آتی ہے کہ راشد نے فارسی ادب اور تہذیب و تاریخ سے اپنا رشتہ قائم کیا تھا۔ اس کا اثر ان کی شاعری پر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران جانے سے قبل بھی راشد کا انداز سخن یہی تھا۔ راشد کی زبان کے تعلق سے یہ بات سب سے پہلے

مظفر علی سید نے کہی ہے ۔ایسا اس وجہ سے بھی ہے کہ مظفر علی سید کو راشد کے ساتھ تہران میں وقت گذارنے کا کچھ موقع میسر آیا ۔پھر راشد کی زندگی ،شاعری اسلوب و آہنگ اور ان کے فکری سر چشموں پر مظفر علی سید کی نظر بہت گہری تھی ۔ضیاء جالندھری کے حوالے سے مظفر علی سید لکھتے ہیں:

> ''ضیاء جالندھری صاحب کے خیال میں،اجنبی کی نظر ایران کا مکمل اور گہرا مطالعہ نہیں کر پائی ۔ گویا عصری تصویر کشی کے بظاہر سیاسی پس منظر میں وہ روح کی ایسی گہرائیاں نہ دیکھ پائے جن کی طرف بطرس توجہ دلا چکے تھے''۔(۴)

مظفر علی سید نے ضیاء جالندھری کی اس رائے کا دفاع کیا ہے اور اس تناظر میں یہ بات کہی ہے کہ ارض عجم نے ایک اجنبی سپاہی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا اور اس کے روحانی کرب سے بیگانہ ہی رہی ۔مظفر علی سید نے اس تعلق سے جو باتیں کہی ہیں اس سے راشد پر لگے الزام کا پوری طرح دفاع نہیں ہو پاتا ۔ ماوراء کی نظمیں ہوں یا پھر ایران میں اجنبی کی نظمیں بیشتر جگہوں پر احتجاج کا رویہ نظر آتا ہے ۔یہ احتجاج داخلی کرب اور روح کی گہرائیوں کا سوز محسوس کرنے کے بعد پیدا شدہ کیفیت کا اظہار ہے ۔یہ داخلی کرب ایران میں اجنبی کی ابتدائی فصل کے تیرہ کینٹوز میں بھی ہے اور سباویراں جیسی نظم میں بھی ۔راشد کی نظم سباویراں میں ملک سبا کا زوال پورے مشرق کا زوال بن گیا ہے ۔مظفر علی سید نے جس طرح راشد کی ایرانی زندگی کی تصویریں کھینچی ہیں اور قیام ایران کے دوران ان کی فکری ارتقا کے متعلق جو گفتگو کی ہے وہ راشد کی پیچیدہ نظموں اور اس کے پس منظر کو سمجھنے میں بہت معاون ہے ۔راشد کا فکری کینوس جس قدر وسیع ہے ان کے عہد کا کوئی بھی شاعر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔شمیم حنفی نے تو اپنے ایک مضمون ''خود کوزہ و خو کوزہ گر و خود گل کوزہ'' میں راشد کو دانشورانہ آہنگ اور تفکر کے اعتبار سے غالب اور اقبال کے بعد تیسرا سب سے جاذب نظر شاعر قرار دیا ہے،اور یہ بات کہی ہے کہ راشد کے یہاں جو تفکر کی گونج سنائی دیتی ہے وہ فیض ،میراجی ، مجید امجد اور اختر الایمان کے یہاں نہیں ہے ۔دانشورانہ آہنگ کا مطلب راشد کا فارسی اسلوب اور تراکیب ہو سکتی ہیں ۔ممکن ہے شمیم حنفی کے ذہن میں دانشورانہ آہنگ کی کوئی اور تعبیر ہو ۔مظفر علی سید نے بطرس کے دیباچہ کے حوالے سے راشد اور انیسویں صدی کے انگریز شاعر براؤننگ کے مابین تقابل کی بات کی ہے ۔یہاں انھوں نے یہ بنیادی سوال اٹھایا ہے کہ براؤننگ کے ڈرامائی مونولوگ سے راشد نے کیا کچھ سیکھا اور اسے کس طرح برتا ۔اس تعلق سے مظفر علی سید کا خیال ہے کہ ایران میں اجنبی کے کم سے کم پانچ کینٹوز اسی تکنیک میں لکھے گئے ہیں ۔من و سلوی، دست ستمگر، کیمیاگر اور تیل کے سوداگر وغیرہ میں خطابت زیادہ اور ڈرامائیت کم ہے ۔راشد کی نظموں میں جہاں تک خود کلامی کی بات ہے تو ان تیرہ کینٹوز کے علاوہ دیگر نظموں میں بھی خود کلامی کا لہجہ پایا جاتا ہے ۔ڈرامائی کیفیت تو ایران میں اجنبی کی دوسری نظموں میں بھی موجود ہے ۔اس تعلق سے جو مظفر علی سید نے راشد کی تین چار نظموں کا تذکرہ کیا ہے جن میں ''حرف نا گفتہ''،

''یہ دروازہ کیسے کھلا''، ''زندگی مری سہ نیم'' بطور خاص قابل غور ہیں۔ راشد کی ان نظموں میں خود کلامی بھی موجود ہے اور ڈرامائی کیفیت بھی۔ ''یہ دروازہ کیسے کھلا'' میں ڈرامائی عنصر زیادہ نظر آتا ہے۔ ان تین نظموں کے تعلق سے شمس الرحمان فاروقی نے اپنے مضمون ''ایران میں اجنبی، ن م راشد کی تین نظمیں'' میں اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ راشد کی یہ تین نظمیں اسلوب موضوع اور لہجہ کے اعتبار سے بہت مختلف ہیں۔ مظفر علی سید نے راشد کی نظم حسن کوزہ گر پہ بھی گفتگو کی ہے۔ حسن کوزہ گر چار حصوں میں ہے۔ اس میں ڈرامائیت بھی ہے اور خود کلامی بھی۔ مظفر علی سید کا خیال ہے کہ اس نظم میں راشد نے اپنے کردار کو اپنے اوپر تقریباً منطبق کر لیا ہے۔ یہ صرف راشد کا کردار نہیں ہے بلکہ پورے مشرق کی ایک شکل ہے جو حسن کوزہ گر کے کردار میں جذب اور ضم ہو گئی ہے۔ شمیم حنفی لکھتے ہیں:

> ''اس نظم کو راشد کی عمومی مجموعی حسیت کے نچوڑ اور ان کی زندگی کے عمر بھر کے تجربے کی اساس کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے''۔ (۵)

راشد کی زندگی اور ان کے عمر بھر کے تجربے کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا تھا وہ مشرق کی تاریخ و تہذیب تھی۔ اس روشنی میں ایک نامعلوم مستقبل سے راشد کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے۔ اس تناظر میں راشد کی یہ نظم حسن کوزہ گر بہت بامعنی ہو جاتی ہے۔ مظفر علی سید نے اختر الایمان کی شاعری کو تیسری آواز کہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ نئی شاعری کی ایک آواز تو فیض کی تھی جس میں غنائیت اور شیرینی تھی۔ دوسری آواز راشد کی آواز تھی جس میں لطافت کے بجائے صلابت کا رنگ تھا۔ اختر الایمان کی آواز ان دونوں آوازوں سے مل کر تیار ہوئی۔ اختر الایمان کی شاعری کے تعلق سے یہ بات کہی گئی ہے کہ وہ نثر زدہ شاعری ہے۔ اس میں تراکیب کا کم کم استعمال ہوا ہے لیکن اس نثر زدہ شاعری کی نثر کرنا بھی آسان نہیں ہے۔ مظفر علی سید نے اختر الایمان کی شاعری کے بنیادی مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اختر الایمان کی نظموں میں ایک ایسی بے طرفی اور غیر جانبداری نظر آتی ہے جس میں تجربے کو فاصلے پر رکھ کر مشاہدہ کیا گیا ہے اس طرح یہ مواصلاتی مشاہدہ پڑھنے والے کے لیے بیک وقت ایک محسوساتی تجربہ اور شعوری تبصرہ بن کر سامنے آتا ہے اور یہ شاعری آپ بیتی ہونے کے باوجود جگ بیتی کی طرح پڑھی جا سکتی ہے''۔ (۶)

تجربے کو فاصلے پر رکھ کر مشاہدہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ اپنے اوپر بیتے ہوئے واقعات و معاملات کا از سر نو پوری ایمانداری کے ساتھ تجزیہ کیا جائے۔ مشاہدے کا یہ طریقہ آسان نہیں ہے۔ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دینے کی بات تو میر کے تعلق سے بھی کی گئی تھی لیکن میر کی زندگی، معاشرت اور اس کا تاریخی سیاق اختر الایمان سے بہت مختلف تھا۔ مظفر علی سید نے اختر الایمان کی نظموں میں ڈرامائی کیفیت اور مکالماتی انداز بیان کی بات بھی کی ہے۔ یہ صرف اختر الایمان کا امتیاز نہیں ہے بلکہ راشد کے یہاں بھی یہ فنی سروکار موجود ہے۔

البتہ اختر الایمان کی نظموں کا کھردراپن اگر چہ ان کے آہنگ اور الفاظ کی بندش میں ایک طرح کی لڑکھڑاہٹ پیدا کردیتا ہے مگر یہ کھردراپن ان کی نظموں کی خوبی بھی ہے اور اختر الایمان کی نظموں کا امتیاز بھی ۔مظفر علی سید نے اختر الایمان کی رجعت پسندی کے متعلق بھی گفتگو کی ہے ۔وزیر آغا نے اپنے مضمون میں اختر الایمان کو مراجعت کی ایک مثال قرار دیا تھا ۔وزیر آغا نے پہلی بار یہ بات کہی تھی کہ اختر الایمان نے زندگی کی داخلی سطح سے خارجی سطح کی طرف مراجعت کی تھی ۔اختر الایمان کے پہلے مجموعے ''گرداب'' کے سلسلہ میں فراق نے یہ کہا تھا کہ نئے شاعروں میں سب سے گھائل آواز اختر الایمان کی ہے ۔مظفر علی سید نے اختر الایمان کے جن نکات کی طرف اشارہ کیا ہے اس میں ایک اہم موضوع اختر الایمان کی نظموں میں انسان کی دربدری ہے ۔اختر الایمان کے یہاں یہ موضوع متعدد جگہوں پر نظر آتا ہے لیکن اس میں یکسانیت نہیں ہے ۔اختر الایمان نے اس ایک موضوع کو مختلف انداز سے برتا ہے ۔

''ناصر کاظمی ایک گم گشتہ نوا'' میں مظفر علی سید نے ناصر کاظمی کی دو غزلوں کا تجزیہ کیا ہے ۔اس میں پہلی غزل تو ''دیوان'' کی غزل اول ہے جس کا مطلع یہ ہے:

آرائش خیال بھی ہو دل کشا بھی ہو
وہ درد اب کہاں جسے دل چاہتا بھی ہو

دوسری غزل وہ ہے جس کی ردیف شام فراق ہے ۔ناصر کی غزلوں میں ایسی اور بھی غزلیں موجود ہیں جن کے ذریعہ ناصر کی شاعری کے متعلق گفتگو ہو سکتی ہے ۔مظفر علی سید نے ناصر کی زبان و اسلوب کے بجائے ان کی شاعری کے مواد و موضوع اور اس کے ماخذ پر انحصار کیا ہے ۔ناصر کاظمی کے داخلی ماحول سے مظفر علی سید کو بس اتنا ہی سروکار ہے کہ وہ ادھر ادھر سے سنی ہوئی باتوں کو پورے اعتماد کے ساتھ ذاتی دریافت بنا کر پیش کر سکتے تھے ۔مظفر علی سید نے ناصر کاظمی کی کم مائیگی اور کم علمی کے مسائل اٹھائے ہیں اور ان باتوں کا دفاع بھی کیا ہے ۔ان کا خیال ہے کہ ناصر کو مغرب کے جدید علوم و فنون سے گہری آشنائی کا موقع نہیں ملا ۔وہ اس واقعہ کا بھی تذکرہ کرتے ہیں کہ ناصر نے دانشوروں کی محفل میں یا تو اشعار سنائے یا خاموشی اختیار کی ۔اس کے ساتھ مظفر علی سید نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ناصر اس قدر نا خواندہ بھی نہیں تھے جتنے آج کے دانشور ہوتے ہیں ۔انھوں نے جس قدر اپنے محدود مطالعے سے فائدہ اٹھایا آج کے دانشور اتنا فیض اپنے مطالعے سے نہیں اٹھاتے ۔مظفر علی سید نے ناصر کی زندگی کی بہت ساری باتوں کو گفتگو کا موضوع بنایا ہے ۔اس نوع کی تمام باتیں ناصر کاظمی کے شعری متن سے بہت کم سروکار رکھتی ہیں ۔ناصر کاظمی کس قدر خواندہ تھے اور کس قدر نا خواندہ ناصر کے متن کے سامنے تمام باتیں بے معنی ہو جاتی ہیں ۔خود ناصر کے عہد میں بہت سارے دانشوروں نے شاعری کی ہے ۔لیکن ان کی شاعری کوئی کشش نہیں رکھتی ۔مظفر علی سید کے مضمون میں وہ حصہ جہاں انھوں نے ناصر کی غزلوں کا تجزیہ

کیا ہے اوران کی غزل میں رفتگاں کے موضوع پر گفتگو کی ہے وہ بہت اہم ہے ۔ناصر کی آواز میر کی آواز سے بہت مماثل ہے اور پھر ناصر کے یہاں فراق کا اثر بھی موجود ہے ۔مظفر علی سید نے کئی جگہ ناصر کے یہاں فراق کا اثر تلاش کیا ہے ۔ہم عام طور سے کسی شاعر کو کسی دوسرے شاعر سے مماثل قرار دے دیا کرتے ہیں لیکن ان چیزوں کی نشاندہی آسان نہیں ۔ناصر کاظمی والے مضمون میں مظفر علی سید نے جس طرح ناصر کے یہاں رفتگاں کے مضامین تلاش کیے ہیں وہ اصل دیکھنے کی چیز ہے ۔

رفتگاں کا نشاں نہیں ملتا
اگ رہی ہے زمیں پر گھاس بہت

اگر رفتگاں کی یاد میں ناصر کاظمی صرف مندرجہ بالا شعر کہہ لیتے تو کافی ہو جاتا ۔مظفر علی سید نے بھی اس شعر کو اپنے مضمون میں شامل کیا ہے ۔وہ اس ضمن میں انفرادی طور پر ہر شعر کو موضوع گفتگو نہیں بناتے ۔بلکہ انھوں نے اجتماعی طور پر رفتگاں کے مضمون کے متعلق گفتگو کی ہے اور اس بات کی وضاحت کی ہے کہ ناصر کے کس شعر میں کون گمشدہ ہے ۔ناصر نے جہاں رفتگاں یا گزرے ہوئے لوگوں کی بات کی ہے وہاں یہ بات نہیں کہی جا سکتی کہ رفتگاں یا لوگ کے لفظ سے فلاں اشخاص یا افراد ہی مراد ہیں ۔اس تنقیدی رویے میں معنی کا دائرہ محدود ہو جائے گا ۔شعر متعدد معنی کا متحمل نہیں رہ سکتا ۔ممکن ہے کوئی قاری ان الفاظ میں کچھ دوسرے معنی تلاش کر لے ۔لہذا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ناصر کی غزل میں رفتگاں یا لوگ کا لفظ فلاں شخص کی جانب دلالت کرتا ہے ۔

''سخن اور اہل سخن'' میں منٹو کے موضوع پر دو مضامین شامل ہیں ۔ایک مضمون ''منٹو کی کرداریات'' پہ ہے اور دوسرا ''افسانہ ساز منٹو'' کے عنوان سے ہے ۔مظفر علی سید نے اپنے مضمون منٹو کی کرداریات میں منٹو کے متنازع فیہ کرداروں اور ان کے رویوں پر گفتگو کی ہے ۔ان کا خیال ہے کہ منٹو کو سرسری طور پر پڑھنے کے بعد لوگوں کو یہ گمان گزرتا ہے کہ منٹو کا موضوع صرف طوائف ہے ۔بلاشبہ منٹو نے طوائف کے موضوع پر کئی کامیاب کہانیاں لکھی ہیں ۔خود اس مضمون میں بھی منٹو کے یہی کردار گفتگو کا محور ہیں ۔منٹو کو بیشتر انھی کرداروں کی وجہ سے پڑھا گیا ۔ان کرداروں کے علاوہ بھی منٹو کی کہانیوں میں کردار موجود ہیں لیکن شاردا، جانکی، خوشیا اور زینت جیسے کرداروں نے قاری کو زیادہ متاثر کیا ۔طوائف کے موضوع پر مشتمل کہانیوں کے مقابلے میں منٹو کی دیگر کہانیاں کم پڑھی گئیں ۔مظفر علی سید نے اس مضمون میں سوگندھی، زینت، بابو گوپی ناتھ، رکما، راج کشور، خوشیا اور شہزادہ غلام علی جیسے کرداروں کی نفسیاتی کیفیات اور رویے پر گفتگو کی ہے ۔ان کرداروں کی تخصیص و عامیانہ پن پر بالتفصیل وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''منٹو abnomality of the normal اور normality of the abnormal کا قائل ہے انسانوں کی معمولی اور غیر معمولی خانوں میں تقسیم اسے بڑی سطحی سی معلوم ہوتی ہے ۔''(۷)

منٹو نے جس عہد میں طوائف اور دلال کے موضوعات پر کہانیاں لکھیں تھیں وہ آج سے خاصہ مختلف تھا۔منٹو نے اس عہد میں انسان کی جس abnormal زندگی کی normality دریافت کی تھی وہ آج زیادہ حقیقت پر محمول کی جاسکتی ہے۔منٹو کے کرداروں پر یہ الزام تھا کہ منٹو کی طوائف اور دلال اپنے غلیظ پیشے کے باوجود ایک انسانی جذبے، ہمدردی اور خلوص سے مملو ہوتے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔یعنی اصل زندگی میں طوائف اور دلال ان جیسے انسانی اوصاف سے متصف نہیں ہوتے۔مظفر علی سید نے منٹو پر لگے الزام کا رد کیا ہے۔ظاہر ہے اصل دنیا میں طوائف اور دلال کی زندگی اگر چہ غلیظ ہوتی ہے لیکن بطور انسان ان میں بھی ایک انسانی جذبہ ضرور پایا جاسکتا ہے۔اپنے مضمون افسانہ ساز منٹو میں مظفر علی سید نے منٹو کے بیانیہ اسلوب، اس کی کہانیوں کے مزاج کی نشتریت سے بحث کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''منٹو ایک بیدرد اور سفاک حقیقت نگار ضرور ہے لیکن اس کے متعدد افسانوں کی تہ میں ایک عمیق اور نازک دردمندی پائی جاتی ہے جو رقیق القلب قسم کے جذباتی افسانوں میں نہیں ملتی۔ بابو گوپی ناتھ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ جیسے افسانوں میں بظاہر مرکزی کردار کے ساتھ استہزائی لہجہ روا رکھا جاتا ہے لیکن بالآخر جب شخصیت کی پرتیں کھلتی ہیں تو ان کا دکھ ہمارا دکھ بن جاتا ہے''۔(۸)

منٹو کی سفاک حقیقت نگاری کے تعلق سے بہت کچھ لکھا گیا۔مقدمے چلے لیکن بالآخر منٹو کی حقیقت نگاری کو بھی تسلیم کیا گیا۔منٹو کے افسانوں اور کرداروں کے تئیں مظفر علی سید کی تنقید مثبت ہے۔وہ ان کی مطعون کہانیوں اور کرداروں میں زندگی کی سچائی اور سادگی دیکھتے ہیں۔منٹو کی زندگی اور شخصیت کو کسی تحریک و تنظیم کے حوالے سے نہیں دیکھنا چاہتے۔ان کا خیال ہے کہ ایک بڑا فنکار کسی تحریک اور تنظیم کے دائرے میں بہت دیر تک قید نہیں رہ سکتا۔منٹو کی ترقی پسندی پر بھی سوال اٹھائے گئے۔حلقہ میں ان کی شرکت پر بہت واویلا مچا۔مظفر علی سید کا خیال ہے کہ منٹو کی شخصیت ان ہنگاموں سے بہت بلند تھی:

> ''اصل میں منٹو فنکار کی آزادی کا نقیب تھا۔جہاں تک سماجی سیاسی رجحانات کا تعلق ہے وہ ۳۶ء کا منشور شائع ہونے سے پہلے بھی اتنا ہی ترقی پسند تھا جتنا کہ آخر دم تک رہا اور جہاں تک فنی اقدار اور انسانی نفسیات سے اس کی وابستگی کا تعلق ہے تو یہ رجحان بھی اس کے یہاں حلقۂ ارباب ذوق کے قیام سے پہلے موجود تھا''۔(۹)

مظفر علی سید کی دونوں تحریریں منٹو کے فن اور شخصیت پر ایک مثبت روشنی ڈالتی ہیں۔منٹو کے فن اور شخصیت پر جتنے الزامات عائد کیے گئے یہ دونوں تحریریں ان الزامات کا رد بھی ہیں۔ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد منٹو کے فن اور شخصیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

منٹو کے بعد مظفر علی سید نے دو مضامین بیدی پر لکھے ہیں۔ایک مضمون تو بیدی کی مشہور کہانی

''گرہن'' کے تجزیے پر مشتمل ہے ۔دوسرا مضمون ''بیدی کا المیہ'' کے عنوان سے ہے۔''بیدی گرہن میں''میں مظفر علی سید نے بیدی کے ایک نئے اسلوب کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ان کے خیال میں گرہن کے بیدی دانہ ودام کے بیدی سے بہت مختلف ہیں ۔دانہ ودام میں بھولا، ہمدوش، چھوکری کی لوٹ، تلادان اور گرم کوٹ جیسی کہانیاں شامل ہیں جبکہ گرہن میں اغوا، غلامی، تلچھٹ، رحمٰن کے جوتے، زین العابدین اور گھر میں بازار میں جیسی کہانیاں ہیں ۔اس میں ''گرہن'' بھی ہے۔

> ''دانہ ودام کے بعد بیدی کے یہاں واضح طور پر چیخوف سے جدائی شروع ہو جاتی ہے اور بالآخر وہ منٹو کے بے حد قریب پہنچ جاتے ہیں مگر اس وقت ہمارا مرکز توجہ ان کا وہ افسانہ ہے جہاں اس عمل کا آغاز ہوتا ہے ۔ذرا ایک نظر گرہن پر ڈال کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا اب بھی کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ بیدی کے یہاں تیز جذبات، غیر معمولی واقعات اور طوفانی حادثات شاذ ہی ملتے ہیں''۔(۱۰)

بیدی کے افسانوں کے تعلق سے یہ بات کہی گئی ہے کہ ان کی کہانیوں میں چیخوف کا رنگ پایا جاتا ہے ۔گرہن سے ایک نئے بیدی کو دریافت کرنا خصوصاً جس میں چیخوف سے علاحدگی ہوا ایک نئی بات ہے ۔گرہن میں بلاشبہ تیز جذبات اور طوفانی حادثات ہیں لیکن گرہن میں شامل دوسری کہانیوں میں بھی اس نوع کے شدید جذبات ہیں ۔ ''اپنے دکھ مجھے دے دو''اور''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' کی تمام کہانیوں میں بھی تیز جذبات اور طوفانی حادثات نظر آتے ہیں لیکن ان کا ہمدردانہ اور مشفقانہ رویہ بھی اس کے ساتھ ساتھ نظر آتا ہے ۔مظفر علی سید نے گرہن میں اساطیری جڑوں کا سرے سے انکار کیا ہے ۔ان کا خیال ہے کہ ہندوستان کے ناقدین بیدی کی کہانیوں میں اساطیری اور دیومالائی عناصر تلاش کرتے ہیں ۔''بیدی گرہن میں'' پڑھنے کے بعد یہ معلوم ہوتا ہے کہ مظفر علی سید کے نزدیک گرہن میں اساطیر اور مابعد الطبیعاتی فضا مفقود ہے ۔حالانکہ چاند گرہن میں اساطیر اور مابعد الطبیعاتی تذکرہ ہی دیومالائی عناصر کا اظہار ہے ۔ان دیومالائی عناصر کے باوجود انھوں نے گرہن کی فضا میں اساطیر سے انکار کیا ہے ۔

کتاب کا آخری مضمون ''میرؔ کی فارسی سخن گوئی برصغیر کے تہذیبی پس منظر میں'' ہے ۔یہ اس کتاب کا سب سے طویل مضمون بھی ہے جو پچاس صفحات پر مشتمل ہے ۔اس مضمون کو دس حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے ۔ مضمون کی نوعیت تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی ۔مظفر علی سید نے بعض ایسی اطلاعات فراہم کی ہیں جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہیں ۔میرؔ نے دو برس تک اردو چھوڑ کر صرف فارسی شاعری کی تھی اور ان کا فارسی دیوان تقریباً تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے ۔لیکن میر کی فارسی شاعری کو قابل اعتنا نہیں سمجھا گیا ۔مظفر علی سید کا خیال ہے کہ میرؔ کی فارسی شاعری اگرچہ میرؔ کی ریختہ گوئی کے ہم پلہ قرار نہیں پا سکتی لیکن آج جب کہ ہم مطالعہ میرؔ کی طرف اس قدر

راغب ہوئے ہیں تو میرؔ کی فارسی گوئی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔انھوں نے میرؔ کی فارسی شاعری کے تعلق سے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مولوی عبدالباری آسی نے دیوان میرؔ (فارسی) کو محض تفنن طبع اور خانہ پری پر محمول کیا۔ اس ضمن میں مظفر علی سید نے عبدالباری آسی کی کوتاہیوں کو بھی آشکار کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ عبدالباری آسی نے جو دیوان میرؔ (فارسی) کا انتخاب پیش کیا ہے وہ اول تو ایک دو صفحات پر مشتمل ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں صرف ردیف الف یعنی دیوان کے ابتدائی چند صفحات شامل ہیں اور انتخاب کا یہ رویہ میرؔ کی فارسی شاعری کی وضاحت کی تئیں پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔مظفر علی سید کا خیال ہے کہ جس دور میں میرؔ و سوداؔ فارسی کے قدیم مضامین اور فارسی شاعری کے کلاسیکی اساتذہ کا معیار سخن قائم کرنے میں کوشاں تھے اسی عہد میں ایرانی شعرا بھی اپنے متقدمین کی پیروی کر رہے تھے۔اس ضمن میں مظفر علی سید نے ہندوستان کی فارسی شاعری کی روایت اور اسی عہد میں ایران کی فارسی شاعری کو موضوع بحث بنایا ہے:

> ''بعد میں اسی قسم کے اعتراضات بہت سارے ایرانی علماء و ادباء نے برصغیر کے اکثر فارسی شعراء پر (ماسوا مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو) بلکہ ان ایرانی شعراء پر بھی جو یہاں (ہندوستان) مقیم ہو گئے تھے وارد کیے ہیں۔یہاں تک کہ فارسی کے خاص انداز تحریر کا نام سبک ہندی رکھ دیا گیا جسے جملہ اعتراضات کا خلاصہ کہنا چاہئے (اگر چہ بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ اس قسم کا انداز تحریر پہلے سے ایران میں شروع ہو چکا تھا تو پھر اسے سبک اصفہانی قرار دے کر اس کی بعض خوبیوں کی دریافت بھی شروع ہو گئی''۔(۱۱)

اس اقتباس میں اعتراضات سے مراد تکرار مطالب، حشو و زائد کا استعمال، بے محاورگی، بے ربطی، تصرفات اور مہمل نویسی ہے۔دراصل اس قسم کے اعتراضات خان آرزو نے شیخ علی حزیںؔ کی شاعری پہ کیے تھے اور پھر ایرانی ادیبوں نے یہی اعتراضات برصغیر کے فارسی شعرا پر کیے۔اس ضمن میں مظفر علی سید نے میرؔ سے قبل ہندوستان کی فارسی شاعری کی کیفیات کا جائزہ لیا ہے اور بیدلؔ عظیم آبادی سے ناصر علی سرہندی تک کی فارسی شاعری سے بحث کی ہے اور یہ سوال قائم کیا ہے کہ میرؔ و سوداؔ اور اس عہد کے دیگر شاعروں کی نظر ایران کی کلاسیکی شاعری کی طرف کس طرح پڑی۔خان آرزو کی رہنمائی سے؟ یا شاہ گلشن کی ہدایت سے؟ مظفر علی سید نے خان آرزو کی زندگی، شخصیت، ان کے کمالات اور میرؔ کے ساتھ ان کے رشتے پر بھی روشنی ڈالی ہے۔میرؔ ایک مدت تک خان آرزو کے ساتھ رہے اور پھر ان سے علاحدگی و رنجش بھی ہو گئی جس کا میرؔ نے ذکر میرؔ میں تذکرہ کیا ہے۔یہاں ایک بات قابل غور ہے کہ میرؔ ذکر میرؔ میں تو خان آرزو کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن نکات الشعراء میں اس رنجش کا اظہار نہیں کرتے۔مظفر علی سید کا خیال ہے کہ نکات الشعراء اور ذکر میرؔ کے علاوہ میرؔ نے خان آرزو کا ذکر اپنی شاعری میں

بھی کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ خان آرزو سے رنجش اور علا حدگی کا ردعمل میرؔ کی اردو شاعری کے علاوہ فارسی شاعری میں بھی ہے۔فارسی شاعری میں یہ تلخی زیادہ بڑھ جاتی ہے:

مسلم ایں کہ دارد عیب ہا میرؔ
بحمد اللہ کہ چوں تو بے وفا نیست

ناصح ! جنوں زیادہ شد آخری ز پند تو
نفعے نہ کرد، داروے ناسود مند تو

ان اشعار کے تعلق سے مظفر علی سید کا خیال ہے کہ میرؔ کی فارسی شاعری میں شیخ، واعظ، ناصح اور زاہد کا مضمون محض روایتی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس میں میرؔ کی ذاتی واردات کا زور محسوس ہوتا ہے اور ان روایتی کرداروں پر مشتمل مضامین میں میرؔ کی فارسی شاعری نے اضافہ کیا ہے۔اور پھر ان روایتی کرداروں میں ایک جھلک خان آرزو کی بھی ہے۔مظفر علی سید کے ان تنقیدی خیالات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔عموماً یہ کہا جاتا کہ میرؔ کی فارسی شاعری ان کی اردو شاعری کا چربہ ہے اور ان کی فارسی و اردو شاعری کے مضامین و اسالیب میں بڑی مماثلت ہے۔مظفر علی سید نے میرؔ کے ان فارسی و اردو اشعار کو یکجا کیا ہے جو مضمون اور اسلوب کی سطح پر مماثل ہیں۔اس نوع کے اشعار یکجا کرنے کے بعد انھوں نے ان اشعار کے مابین تقابل بھی کیا ہے۔ان کا خیال ہے کہ ایسے اشعار بہت کم ہیں۔ میرؔ کے یہاں اردو غزلوں میں بھی ایک مضمون کو مختلف انداز سے برتا گیا ہے لہٰذا عین مناسب ہے ایک مضمون جو قبل سے اردو شاعری میں موجود تھا فارسی میں وہ رقم کرتے وقت کچھ مختلف ہو گیا ہو۔

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی — خرامت بطرزے کلامت بطورے
تجھے میرؔ سمجھا ہے یاں کم کسو نے — ترا کم کسے میرؔ فہمیدہ باشد
آگے کسو کے کیجے کیا دست طمع دراز — کے پیش مہمان جہاں می شود دراز
وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے — بالین زیر سر شدہ دست گدائے او

یہاں مظفر علی سید نے مثالیں پیش کرنے کے بعد یہ بھی بتایا کہ کس طرح میرؔ کے یہاں مضامین فارسی و اردو شاعری میں نئی جہت اختیار کر لیتے ہیں۔شاید مظفر علی سید سے پہلے کسی نے اپنے موقف کی تائید میں میرؔ کے کلام کا اس انداز سے جائزہ نہیں لیا تھا۔ان کا خیال ہے کہ میرؔ نے فارسی شاعری میں سعدی اور حافظ سے لے کر عرفی، نظیری، صائب، کلیم بیدل، ناصر علی، شیخ علی حزیں اور خان آرزو تک کی زمینوں کو برتا ہے۔مگر اس کے باوجود میرؔ نے بہت ساری زمینیں خود ایجاد کی ہیں۔ایسی زمینوں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔فارسی شاعری ہی کیا میرؔ نے اردو شاعری میں بھی جس قدر زمینیں ایجاد کی ہیں اردو کا کوئی دوسرا شاعر یہاں تک نہیں پہنچتا۔اس ضمن میں

مظفر علی سید نے بہت ساری ایسی زمینوں کی مثالیں دیں ہیں جو اردو اور فارسی دونوں طرح کی شاعری میں یکساں ہیں۔ یہاں ان میں سے دو مثالیں پیش ہیں:

نشد شور مزاج امسال از تدبیر ہم آخر — غزل شمار 285 - 3 شعر
جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر — دیوان دوم۔ 7 شعر

روئے سخن بوصف رخت نیست سوے گل — غزل شمارہ 341۔ 3 شعر
زنہار گلستاں میں نہ کر منہ کو سوے گل — دیوان ششم ۔ 5 شعر

مظفر علی سید نے میرؔ کے فارسی کلام سے ان غزلوں کے مطلعوں کا انتخاب کیا ہے جن میں کلام میرؔ (فارسی) کا طرز خاص یعنی مضامین تازہ و غیر مبتذل، لطافت ادا اور سوز و گداز صاف نظر آتا ہے، ان میں سے چند مثالیں یہاں پیش کی جاتی ہیں:

لخت دل ہر شب بدامانم ، نمی دانم چرا
ہر سحر سر در گریبانم نمی دانم چرا

سرگزشت من ادا از ہر زمانے می شود
ایں حکایت رفتہ رفتہ داستانے می شود

در محبت محنت بسیار می باید کشید
بہر یک نظارہ صد آزار می باید کشید

میرؔ نے باضابطہ اگرچہ فارسی شاعری کے لیے اپنا استاد نہیں بنایا تھا لیکن شیخ علی حزیںؔ کی نازک مزاجی اور استغنا نے انھیں متاثر کیا۔ مظفر علی سید کا خیال ہے کہ ایسا اس وجہ سے بھی تھا کیونکہ شیخ علی حزیںؔ اس وقت کے موجود بہترین معاصر ایرانی شاعر تھے۔ حزیںؔ کے علاوہ شفائیؔ بھی میرؔ کے پسندیدہ شاعر تھے۔

ہے غزل میرؔ یہ شفائی کی
ہم نے بھی طبع آزمائی کی

مظفر علی سید کے مطابق میرؔ کی فارسی رباعیاں بھی اردو کی طرح سے سو سے کچھ زیادہ ہیں۔ عبدالباری آسی نے میرؔ کی رباعیات کے تعلق سے لکھا تھا کہ ان میں حکیمانہ اور فلسفیانہ خیالات کی پابندی نہیں ہے لہذا میرؔ کی رباعیات خیام، عطار، ابوالخیر وغیرہ کے مرتبے کو نہ پہنچ سکیں۔ مظفر علی سید نے عبدالباری آسی کے اس خیال کو رد کیا ہے اور کہا ہے کہ فلسفیانہ خیالات کے علاوہ نکتہ آفرینی بھی صنف رباعی کا ایک وصف ہے اور اگر یہ وصف خیام کی رباعیوں سے نکال دیا جائے تو خیام کی بھی آدھی خوبیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس ضمن میں انھوں نے میرؔ کی فارسی

رباعیاں مثال کے طور پر پیش کیں ہیں جن کا خاص وصف نکتہ آفرینی ہے ۔دیکھیے :

ہر لحظہ چو موج اضطرابے داری　　　ہر دم رفتار تند آبے داری
صرصر گوئیم یا کہ بروقت خوانیم　　　اے عمر عزیز بس شتابے داری

مظفر علی سید نے میر کی ایک فارسی مثنوی کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ 116 اشعار کی مثنوی ہے جسے میر نے کوئی نام نہیں دیا ۔ان کا خیال ہے کہ اسے خسرو شاہ یا انقلاب دوراں کا نام دیا جا سکتا ہے ۔اس کا قصہ نہایت مختصر ہے اور ابتدائیہ خاصہ بڑا ہے ۔میر نے اصل قصہ نہایت عمدگی اور جزالت کے ساتھ لکھا ہے ۔مظفر علی سید اس مثنوی کے مختلف نسخوں کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں کہ ابو للیث صدیقی نے علی گڑھ یونیورسٹی کے بسم اللہ کلیکشن سے جو میر کے دیوان فارسی کا ایک مخطوطہ حاصل کیا ہے اور اس میں جو ایک نا تمام مثنوی کی نشاندہی کی ہے وہ شاید اسی مثنوی کا حصہ ہے اور اختر علی تلہری نے بھی مخطوطہ لکھنؤ کا حوالہ دیا ہے اور اس کے ابتدائی اشعار اپنے مقالے میں رقم کیے ہیں ۔مگر قصہ رقم نہیں ہے ۔مظفر علی سید کا خیال ہے کہ اب یہ مثنوی مطبوعہ شکل میں مکمل ہی معلوم ہوتی ہے ۔مضمون کا آخری حصہ میر کی فارسی شاعری کی قدر و قیمت ،اس کی اہمیت و وقعت اور ہندوستانی فارسی شاعری و ایرانی شاعری کے درمیان اس کے مرتبے پر مشتمل ہے ۔اس طور سے مظفر علی سید نے میر کی فارسی شاعری کو دس حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد علاحدہ علاحدہ طور سے گفتگو کی ہے اور فارسی شاعری میں دیوان میر (فارسی) کا مرتبہ متعین کیا ہے ۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) سخن اور اہل سخن، مظفر علی سید، مرتب انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء صفحہ ۷
(۲) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۱۴
(۳) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۱۴۴
(۴) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۱۵۰
(۵) رسالہ اردو ادب: ن،م راشد نمبر صفحہ ۳۷
(۶) سخن اور اہل سخن، مظفر علی سید، مرتب انتظار حسین، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۲۰۱۶ء صفحہ ۲۰
(۷) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۵۱
(۸) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۶۳
(۹) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۵۸
(۱۰) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۷۰
(۱۱) سخن اور اہل سخن، ایضاً صفحہ ۲۴۳